لغات واعرابِ قرآن (۴۵)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرۃ (۲۹)

آیات ۴۲ ــــ ۴۴

(گذشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳، اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

[أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ] یہ تین کلمات ہیں أ + تأمرون + الناس ــــ ہر ایک کی الگ الگ وضاحت یوں ہے:

"أ" ہمزۃ استفہام ہے جس کا عام اردو ترجمہ "کیا" یا "آیا" سے کیا جاسکتا ہے اس کے ذریعے عام طور پر تو دو چیزوں کے بارے میں ایسا سوال کیا جاتا ہے جس کے جواب میں ان دو چیزوں میں سے ایک کا نام لیا جاسکتا ہے ــــ اور کبھی ایسا سوال ہوتا ہے جس کے جواب میں "ہاں" یا "نہیں" کہا جاسکتا ہے ــــ اور کبھی اس میں "آخر تم ایسا کیوں کرتے ہو کہ ..." کا مفہوم ہوتا ہے' ــــ اس میں دراصل سوال کرکے ہاں یا نہیں میں جواب لینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس کام کی مذمت مقصود ہوتی ہے ــــ اور یہی بات زیرِ مطالعہ عبارت میں موجود ہے۔ نیز دیکھئے "أ" کے معنی و استعمال کے لیے [۲:۵:۱(۳)]

"تَأْمُرُوْنَ" کا مادہ "أ م ر" اور وزن "تفعلون" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "امَرَ یامُرُ" (حکم

دینا) کے باب معنی اور استعمال کی وضاحت البقرہ: ۲۷ [۲:۲۰:۱(۵)] میں لی جاچکی ہے۔ یہ اس فعل مجرد سے مضارع جمع مذکر حاضر ہے جس کا ترجمہ "تم حکم دیتے ہو" ہے۔

"النَّاسَ" جس کا عام ترجمہ "لوگ" یا "لوگوں" ہے۔ اس کے مادہ اور اشتقاق وغیرہ کی بحث البقرہ: ۸ [۲:۷:۱(۳)] میں گزر چکی ہے۔

● اس طرح اتنے حصہ عبارت (أتامرون الناس) کا ترجمہ بنتا ہے "کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو" — تاہم اس کا پورا بامحاورہ ترجمہ اگلے کلمات (بِالْبِرِّ) کے ساتھ ہی مکمل ہو سکتا ہے۔

۲:۲۹:۱(۶) [بِالْبِرِّ] کی ابتدائی "باء" (بِ) تو فعل "أَمَرَ يَأْمُرُ" کے مفعول ثانی (مامور به۔ جس چیز کا حکم دیا جائے) سے پہلے آنے والا "صلہ" ہے اس "بِ" کا استعمال البقرہ: ۲۷ [۲:۲۰:۱(۵)] میں بتایا جاچکا ہے۔ اردو میں اس "بِ" کا ترجمہ (یہاں) "... کا (حکم)" سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

● اور کلمہ "البِرّ" کا مادہ "ب ر ر" اور وزن (لامِ تعریف کے بغیر) "فِعْلٌ" ہے (جو یہاں مجرور بالجر ہے)۔ اصلی شکل "بِرْرٌ" تھی جس میں ساکن "ر" متحرک "ر" میں مدغم ہو گئی ہے۔ اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد مختلف ابواب سے مختلف معانی کے لیے بطور فعل لازم و متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے مگر ان سب میں بنیادی مفہوم "نیکی یا بھلائی (کرنے یا پانے)" کا پایا جاتا ہے۔ اور مصدر بھی عموماً ایک (بِرٌّ) ہی رہتا ہے مثلاً

① بَرَّ... يَبَرُّ بِرًّا (فتح سے) کے معنی ہیں: "... کے ساتھ نیکی کرنا" اور یہ خصوصاً والدین کی خدمت اور فرماں برداری کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں "بَرَّ والِدَيهِ" (اس نے اپنے والدین سے حسن سلوک کیا)۔ ایسے آدمی کو "بَرٌّ" بھی کہتے ہیں اور "بارٌّ" بھی۔ پھر "بَرٌّ" کی جمع مکسر "أبْرار" اور "بارّ" کی جمع "بَرَرَة" آتی ہے اور یہ دونوں جمعیں قرآن کریم میں آئی ہیں۔

② بَرَّ يَبِرُّ بِرًّا (ضرب سے) آئے تو اس کے معنی "... کی خوب اطاعت کرنا"، "... کے ساتھ نیکی کرنا"، "... کی نیکی قبول کرنا" (متعدی) بھی ہوتے ہیں اور "قبول ہونا"، "شک وشبہ سے پاک ہونا" (لازم) بھی مثلاً کہتے ہیں "بَرَّ رَبَّه" (اس نے اپنے رب کی خوب اطاعت کی) یا "بَرَّهٗ" (اس نے اس سے نیکی کی) یا "بَرَّ اللّٰهُ حَجَّه" (اللہ نے اس کی حج قبول کی)۔ اور ایسی حج کو اسی لیے حدیث میں بصیغۂ اسم المفعول "حج مبرور" کہا گیا ہے۔ اور بطور فعل لازم کہتے ہیں "بَرَّ حَجُّه" (اس کی حج قبول ہوئی) اور "بَرَّ البَيعُ" (سودا جھوٹ اور خیانت سے پاک ہوا)

③ اور بَرَّ يَبَرُّ بِرًّا (فتح اور ضرب دونوں سے) "بہت نیکو کار ہونا" کے معنی دیتا ہے۔

● قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے تو صرف فعل مضارع کا ایک ہی صیغہ دو جگہ (البقرہ: ۲۲۴ اور

© rasailojaraid.com

الممتحنه : ۸) اور وہ بھی باب فتح سے ہی آیا ہے۔ البتہ اس مادہ (ب ر د) سے ماخوذ اور مشتق مختلف کلمات (برٌّ۔ بَرٌّ۔ ابرار۔ بررۃ وغیرہ) ۲۹ جگہ وارد ہوئے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ (البِرّ) بھی ان ہی کلمات سے ایک ہے۔ اور اس کے معنی "نیکی اور بھلائی" ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ سات بار آیا ہے اور ہر جگہ معرف باللام (البِرّ) ہی استعمال ہوا ہے۔ اور اس لام تعریف کی وجہ سے اس کا ترجمہ "پوری نیکی، ساری نیکیاں، یا حقیقی نیکی (یا نیکیاں)" ہو سکتا ہے یعنی نیکی کی پوری جنس یا نیکی کے سارے کام مراد ہوتے ہیں (جیسے "الحمد" کے معنی "ساری حمد" ہر طرح کی حمد یا ساری تعریفیں" ہیں)

● "البِرّ" کے اسی مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ "بھلائی، نیک کام، نیک کام کرنا اور نیکی کرنا" سے کیا گیا ہے۔ اس طرح مندرجہ بالا عبارت "اتامرون الناس بالبر" (جس کے ابتدائی حصے "اتامرون الناس" پر ابھی اوپر بات ہوئی ہے) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا" بعض حضرات نے آگے آنے والی عبارت "وتنسون انفسکم" (جس پر ابھی بات ہوگی) کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں "الناس" کا ترجمہ صرف "لوگوں کو" کی بجائے "دوسرے لوگوں کو" سے کیا ہے۔ اور یہ اس لحاظ سے درست کہا جا سکتا ہے (بلحاظ محاورہ) کہ اس کے بعد "اپنے آپ کو بھول جانے" کا ذکر ہے بعض مترجمین نے "حکم دینا" کی بجائے "کو کہنا" سے ترجمہ کیا ہے یعنی "کیا تم کہتے ہو لوگوں کو نیک کام کرنے کو" یہ "لوگوں کو نیکی کرنے کو کہتے ہو" اردو محاورے کے مطابق اس موقع پر "کہنا" حکم دینا ہی کا مفہوم رکھتا ہے۔ بعض حضرات نے "لوگوں کو کہتے ہو نیکی کرو" سے بھی ترجمہ کیا ہے۔ یہ بھی صرف محاورہ اور مفہوم کے لحاظ سے درست کہا جا سکتا ہے ورنہ اصل الفاظ سے بہت دور ہے (خصوصاً "البرّ" کا ترجمہ "نیکی کرو" کرنا)

۲ : ۲۹ : ۱ (۷) [وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ] کی ابتدائی "وَ" عاطفہ بھی ہو سکتی ہے اور حالیہ بھی۔ یعنی اس کا ترجمہ یہاں "اور" بھی ہو سکتا ہے اور "حالانکہ یا جب کہ" بھی۔

"تَنْسَوْنَ" کا مادہ "ن س ی" اور وزن اصلی "تَفْعَلُوْنَ" ہے۔ اس کی اصلی شکل "تَنْسَيُوْنَ" تھی۔ جس میں ناقص کے "واو الجمع والے قاعدے" کے تحت لام کلمہ (ی) ساقط ہو جاتی ہے اور ما قبل کی فتحہ (ـَـ) برقرار رہتی ہے اس طرح یہ لفظ "تَنْسَوْنَ" رہ جاتا ہے [ناقص میں واو الجمع کے اس قاعدے کی کئی مثالیں پہلے گزر چکی ہیں مثلاً "لَقُوْا" ۲ : ۱۱ : ۱ (۱)، "خَلَوْا" ۲ : ۱۱ : ۱ (۲) میں]

● اس مادہ سے فعل مجرد "نَسِيَ ... يَنْسَى نَسْيًا ونِسْيَانًا" (سمع سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں "... کو بھول جانا ... کو یاد نہ کرنا یا اسے یاد نہ رکھنا" (یعنی یہ "حَفِظَ" کی ضد کے

© rasailojaraid.com

طور پر استعمال ہوتا ہے)۔ اور اس سے اس میں "عمداً" بھلا دینا یا ترک کر دینا" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس فعل کے حقیقی معنی تو "بھول جانا" ہی ہیں مگر (کبھی) اس کے مجازی معنی کسی چیز کو "عمداً ترک کر دینا" "اس کی پروا نہ کرنا" یا "قابل اعتناء نہ سمجھنا" وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور یہ مجازی معنی سیاقِ عبارت میں کسی قرینہ (اشارہ) سے متعین ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی جگہ "بھول جانے" پر کسی سزا یا مذمت کا ذکر ہو تو یہ اس بات کا قرینہ ہوگا کہ یہاں "بھول جانا" سے مراد عمداً بھلا دینا یا نظر انداز کر دینا ہے۔ کیونکہ خطا یا نسیان پر تو گرفت نہیں ہوتی۔

● یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض اصحاب لغت نے اس فعل کا مادہ "ن س و" ہی قرار دیا ہے[1] ویسے یہ مادہ (ن س و) بھی اگر باب سمع سے آتے تو "نَسِیَ یَنْسیٰ" (رضی یرضی کی طرح) ہی ہو جائے گا۔ تاہم "نسِی ینسی" کے مصادر میں "نسیاً اور نسیاناً" کے علاوہ "نَسْوۃ" اور نَساوۃ" بھی مذکور ہوتے ہیں اور مصدر کی یہ "و" مادہ کے واوی الاصل ہونے پر دلالت کرتی ہے نیز اس واوی اللام مادہ (ن س و) سے فعل "نسا ینسو نَسْوۃ" (نصر سے) "کام چھوڑ دینا" کے معنی دیتا ہے مثلاً کہتے ہیں "نسا الرجل" = ترکَ عملَه (یعنی آدمی نے کام چھوڑ دیا)۔ گویا "نسِی ینسَی" کے مجازی معنی اور "نسا ینسو" کے حقیقی معنی ایک ہی ہیں (ترک کرنا)

● تاہم اکثر کتب لغت[2] میں "ن س و" اور "ن س ی" دو الگ الگ مادے بیان ہوتے ہیں۔ اور یہ تین مختلف ابواب (ضرب، نصر اور سمع) سے مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جن میں سے دو تو اوپر مذکور ہوئے ہیں۔ تیسرے معنی قرآن میں نہیں آئے۔ ظاہر ہے کہ "نصر" تو صرف واوی اللام کے لیے ہوگا اور "ضرب" یائی اللام مادہ کے لیے ہی ہو سکتا ہے۔ البتہ "سمع" سے دونوں مادے ایک ہی شکل "نسِی ینسی" میں استعمال ہو سکتے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ "تَنْسَوْنَ" اس فعل مجرد (باب سمع سے) کا فعل مضارع صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اور یہاں (اس آیت میں) چونکہ اس عمل (نسیان) کا ذکر بطور مذمت آیا ہے۔ لہٰذا محض "بھول جانا" کی بجائے "بھلا دینا" یا "ترک کر دینا" مراد لیا جا سکتا ہے۔ تاہم اتفاق سے اُردو زبان میں بھی "بھول جانا" بلحاظ محاورہ "نظر انداز کرنا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اُردو میں صرف "بھولنا یا بھول جانا" (مصدری معنی) کے ساتھ ترجمہ کرنا درست ہوگا ـــــ اس فعل کے (یہاں) مختلف تراجم کا ذکر ہم ابھی اگلے لفظ (انفسکم) کے بیان کے بعد کریں گے۔

● "اَنْفُسَکُمْ" میں ضمیر مجرور "کم" (تمہارا) سے پہلے والے لفظ "اَنْفُسَ" کا مادہ "ن ف س"

---

[1] مثلاً المعجم الوسیط۔ [2] مثلاً القاموس، المنجد، البستان اور اقرب الموارد میں۔

© rasailojaraid.c

اور وزن " اَفعُلٌ " آیا ہے (یہاں ترکیب میں لفظ " اَنفُسَ " منصوب اور خفیف بروزن " اَفعُلَ " آیا ہے اس کی وجہ " الاعراب " میں بیان ہوگی)۔ " اَنفُسٌ " جمع مکسر ہے جس کا واحد " نَفسٌ " ہے۔ اس مادہ (ن ف س) سے فعل کے معنی اور استعمال پر نیز لفظ " انفُس " کے معنی پر البقرہ: ۹ [۸:۲: ۱(۴)] میں بات ہو چکی ہے یہاں " انفسکم " کا ترجمہ " اپنی جانوں کو، اپنے آپ کو " ہوگا۔

● اس طرح فعل " نسِی ینسیٰ " کے حقیقی اور مجازی استعمال نیز لفظ " اَنفُس " کے معنی سامنے رکھتے ہوئے بعض اردو مترجمین نے اس فقرے (تَنسَون اَنفسَکم) کا قریب اللفظ ترجمہ " بھولے جاتے ہو اپنی جانوں کو " یا " اپنی جانوں کو بھولتے ہو " کیا ہے۔ اکثر نے " انفُسَکم " کا ترجمہ " جانوں " سے کرنے کی بجائے " اپنے آپ کو " یا صرف " اپنے کو " سے کیا ہے۔ یعنی " اپنے آپ کو / اپنے کو بھول جاتے ہو " کی صورت میں ——— اور بعض نے " بھول جانا " کی بجائے " خبر نہ لینا " یا " فراموش کرنا " اختیار کیا ہے یعنی " اپنی خبر نہیں لیتے "، اپنی خبر ہی نہیں لیتے " یا " اپنے تئیں فراموش کیے دیتے ہو " کی صورت میں جس میں اردو محاورے کا زور بھی ہے اور محض " بھول جانا " کی بجائے " دیدہ دانستہ بھلا دینا یا ترک کر دینا " کا مفہوم بھی موجود ہے۔

● یہ فعل (نسِی ینسیٰ) متعدی ہے تاہم کئی دفعہ اس کا مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جو سیاقِ عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے (مثلاً خدا یا آخرت) ——— قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے ماضی مضارع وغیرہ کے مختلف صیغے ۴۳ جگہ آئے ہیں۔ ان میں سے قریباً ۸ جگہ یہ فعل مفعول کے ذکر کے بغیر آیا ہے۔ مجرد کے علاوہ اس سے بابِ افعال کے کچھ صیغے بھی (۷ جگہ) وارد ہوئے ہیں۔ اور " امرأۃ " کی جمع مکسر " نِسوۃٌ " اور " نِساءٌ " کا تعلق بھی اسی مادے (وادی اللام) سے ہے۔ اس طرح قرآن کریم میں اس مادہ سے مشتقات کی کل تعداد ساٹھ سے زائد ہے۔

[وَاَنتُم] کی " وَ " یہاں حالیہ ہے اس لیے اکثر نے یہاں اس کا ترجمہ " حالانکہ " سے ہی کیا ہے اگرچہ بعض نے صرف " اور " سے کام چلا لیا ہے اور " انتم " تو ضمیر مرفوع منفصل بمعنی " تم " ہے۔ بعض مترجمین نے اس کے بعد آنے والے فعل مضارع (تتلون) کے صیغہ مخاطب ہونے کی بنا پر اس کا ترجمہ ہی اس طرح کیا ہے کہ " تم " کا الگ ترجمہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی جیسے " پڑھتے ہو " میں خود بخود " تم " کا مفہوم آ جاتا ہے۔

۲: ۲۹: ۱ (۸) [تَتلُونَ] کا مادہ " ت ل و " اور وزن اصلی " تَفعُلُونَ " ہے جس کی اصلی شکل " تَتلُوُونَ " تھی۔ جس میں " ناقص کے واو الجمع والے قاعدے (طریق تکلم) کے مطابق " (جس کا ابھی اوپر " تنسون " کے ضمن میں [۲: ۲۹: ۱ (۷)] بھی ذکر ہوا ہے) لام کلمہ والی " و " گر جاتی ہے

© rasailojaraid.com

اور ماقبل کا ضمہ (ـُـ) برقرار رہتا ہے اور اس طرح لفظ بصورت "تَتلُون" استعمال ہوتا ہے۔

● اس ثلاثی مادہ (ت ل و) سے فعل مجرد مختلف ابواب سے اور مختلف مصادر کے ساتھ متعدد (بلکہ بعض دفعہ متضاد) معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جن سب میں بنیادی معنی "پیچھے پیچھے آنا" کا ہوتا ہے مثلاً (۱) "تلا یتلُو (تلوَ یتلُوُ) تُلُوّاً" (نصر سے) کے معنی "اتَّبعَ" کے ہیں یعنی پیچھے چلنا یا پیروی کرنا اور (۲) تلَی یَتلِی (تلوَ یتلِوُ) تَلْیاً (ضرب سے) کے معنی بھی یہی (پیچھے پیچھے آنا یا چلنا) ہیں ــــ اور (۳) "تَلِی یتلی (تلِوَ یتلوَُ) تَلیً" (سمع سے) کے معنی ہیں "پیچھے رہ جانا۔ باقی رہ جانا" اور (۴) "تلَا یتلُو تِلاوۃً" (نصر سے) کے معنی "پڑھنا" ہیں۔ اور یہ زیادہ تر قرآن مجید کے پڑھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے[1] اس لیے "تلاوۃ" "قراءۃ" سے زیادہ خاص ہے۔ ہر تلاوۃ قراءۃ ہے مگر ہر قراءۃ تلاوۃ نہیں ہوتی (اردو فارسی میں یہ دونوں لفظ لمبی "ت" سے لکھنے کا رواج ہوگیا ہے یعنی تلاوت اور قراءت) بعض نے تلاوت کے معنی بآواز بلند پڑھنا کہ پاس والے کو سنائی دے اور قراءت کے معنی مطلقاً پڑھنا (بآواز بلند یا خاموشی سے) بیان کیے ہیں اس طرح بھی ہر تلاوت قراءت مگر ہر قراءت تلاوت نہیں ہوگی۔

● تلاوت میں بھی بنیادی مفہوم وہی "پیچھے چلنا" کا ہے۔ جو کبھی جسمانی طور پر "پیچھے چلنا" کبھی ذہنی طور پر پیچھے چلنا اور کبھی عملی طور پر "پیچھے چلنا" کے لیے استعمال ہوتا ہے[2]۔ اور تلاوتِ قرآن میں [خصوصاً جسے قرآن کریم نے "حق التلاوۃ" (البقرہ: ۱۲۱) کہا ہے] یہ تینوں مدارج تلاوت مراد ہوتے ہیں نظر اور زبان الفاظ کے پیچھے لگے ہوتے ہیں۔ عقل یا دماغ معانی کے فہم کے پیچھے لگے ہوتے ہیں۔ اور قلب یعنی دل اس عبارت سے حاصل ہونے والی نصیحت یا حکم کے پیچھے لگا ہوتا ہے جس کے پیچھے ارادہ اور عمل آتا ہے۔

● اس فعل (تلا یتلو تلاوۃً) کے مفعول (جس کی تلاوت کی جائے) کے ساتھ اگر ایک دوسرا مفعول "علی" کے صلہ کے ساتھ آئے [جیسے "یتلو علیھم آیاتک (البقرہ: ۱۲۹) میں ہے] تو اس کے معنی "... کو پڑھ کر سنانا" ہوتے ہیں۔ اور اس استعمال میں تلاوت کے "بآوازِ بلند پڑھنا" والے معنی بالکل واضح ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اس فعل مجرد کے مختلف صیغے ساٹھ سے زیادہ جگہ وارد ہوئے ہیں۔ جن میں سے چالیس[۴۰] سے زیادہ جگہ یہ فعل اسی "علی" والے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ اور اگرچہ عام عربی زبان میں اس مادہ سے مزید فیہ کے افعال بھی مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں اس سے افعال (ماضی مضارع امر) کے مختلف صیغے (بلکہ اسماء مشتقہ کے دو صیغے

---

[1] القاموس (للفیروز آبادی) نیز المفردات (راغب) [2] المفردات (راغب)

© rasailojaraid

بھی) تمام کے تمام فعل مجرد سے ہی آتے ہیں۔

● زیرِ مطالعہ لفظ "تَتلُونَ" اس فعل (تلا یتلو تلاوۃً) سے مضارع معروف کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس کا ترجمہ تو "تم پڑھتے ہو" بنتا ہے۔ تاہم خود لفظ "تلاوت" اُردو میں بھی مستعمل ہے اس لیے اس کا ترجمہ "تم تلاوت کرتے ہو" سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ "تم تلاوت کرتے رہتے ہو" اور "پڑھتے رہتے ہو" سے کیا ہے جو آیت کے مجموعی مفہوم کے لحاظ سے زیادہ بامحاورہ معلوم ہوتا ہے۔

[اَلْكِتٰبَ] کا مادہ "ک ت ب" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فِعَالٌ" ہے اس مادہ سے فعل کے استعمال اور خود لفظ "الکتاب" پر البقرہ: ۲ [۲ : ۱ : ۱ (۲)] میں بحث ہو چکی ہے۔ لفظ "کتاب" اردو میں بھی مستعمل ہے۔ یہاں "الکتاب" کے لامِ تعریف کو لامِ جنس یا لامِ عہد سمجھا جا سکتا ہے یعنی "وہ آسمانی کتاب یا وہ کتاب جس کے تم ماننے والے ہو"۔ اسی لیے بعض مترجمین نے یہاں صرف "کتاب" کی بجائے "کتاب الٰہی" یا "کتابِ خدا" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ جسے تفسیری ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔

[۲ : ۲۹ : ۱ (۶)] [اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ] یہ "أَ" (استفہامیہ بمعنی "کیا؟") + "فَ" (عاطفہ بمعنی پس / پھر) + لاتعقلون (تم پر ابھی بات ہو گی) کا مرکب ہے۔ جب حرف استفہام "أ" یا "ھل" اور حرفِ عطف "فَ" یا "وَ" اور "ثُمَّ" اکٹھے آئیں تو استعمال کا قاعدہ یہ ہے کہ "أ" تو حرفِ عطف سے پہلے لایا جاتا ہے مثلاً کہیں گے "أَفَ ... أَوَ ... یا أَثُمَّ ...": — اور "ھَلْ" حرفِ عطف کے بعد استعمال ہوتا ہے یعنی "فَهَلْ" یا "وَهَلْ ...": کہیں گے۔ قرآنِ کریم میں اس دونوں طرح کے استعمال کی کئی مثالیں آئیں گی۔

● "لَا تَعْقِلُوْنَ" کا ابتدائی "لا" تو نفی کے لیے ہے جو عموماً فعل مضارع میں منفی (یعنی "نہ" کے) معنی پیدا کرتا ہے۔

اور "تَعْقِلُوْنَ" کا مادہ "ع ق ل" اور وزن "تَفْعِلُوْنَ" ہے اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد زیادہ تر "عَقَلَ یعقِلُ عَقْلًا" (ضرب سے) اور بعض دفعہ باب "نصر" اور "سمع" سے بھی مختلف معانی کے لیے آتا ہے اور عموماً ان سب میں مشترک مفہوم "باندھنا" اور "روکنا" کا ہوتا ہے بلکہ "عَقْل" (جو مصدر بھی ہے اور اسم بھی) کو عَقْل کہنے کی وجہ یا مناسبت یہی ہے کہ عقل انسان کو ہلاکت سے روکتی ہے۔ (اردو میں لفظ عقل مستعمل ہے ترجمہ کی ضرورت نہیں) اور یہ فعل (عقَل یعقِل) لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں (۱) "عقَلَ الغلام" (لڑکا عقل مند ہو گیا) اسی طرح (۲) "عقَل الشیئَ" (وہ چیز کو سمجھ گیا۔ اس کی حقیقت کو پا لیا) اور (۳) عقَل البعیرَ (اس نے اونٹ کا گھٹنا

© rasailojarai
© rasailojarai

موڑ کر (پاؤں) باندھ دیا) اور (۴) "عَقَلَ الظِلُّ" (دوپہر کے وقت سایہ بڑھنے سے رُک گیا) اور (۵) "عقلَ القَتِیلَ" (اس نے مقتول کا خون بہا ادا کر دیا۔ یعنی خون خرابہ روکنے کے لیے)۔ تاہم ان میں سے اکثر معنی کے لیے یہ فعل قرآن میں استعمال نہیں ہوا۔

● قرآنِ کریم میں اس فعل مجرد کے مختلف صیغے (زیادہ تر بصورت مضارع) پچاس کے قریب مقامات پر آئے ہیں اور ہر جگہ "بات کو سمجھ لینا، سمجھ جانا، عقل رکھنا، عقل مند ہونا، عقل سے کام لینا" (یعنی متعدی ولازم دونوں طرح) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور اکثر جگہ متعدی ہوتے ہوئے بھی اس کا مفعول غیر مذکور (محذوف) ہے۔ بلکہ مفعول کے ذکر کے ساتھ تو یہ فعل صرف تین جگہ (البقرہ: ۷۵، و ۱۷۰ اور العنکبوت: ۴۳) ہی آیا ہے۔ باقی مقامات پر حسب موقع متعدی یا لازم فعل سمجھا جا سکتا ہے ـــــ قرآن کریم میں اس مادہ سے مزید فیہ کا کوئی فعل استعمال نہیں ہوا۔

● اس طرح "لا تعقلون" اس فعل مجرد (عقَل یعقِل) سے فعل مضارع منفی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے اور اس سے پہلے "أ" اور "ف" بھی لگے ہیں اس ترکیب کے نحوی پہلو پر تو آگے "الاعراب" میں بحث آئے گی۔ تاہم ان کلمات (أ، ف، لا، تعقلون) کے الگ الگ معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض اُردو مترجمین نے اس عبارت (افلا تعقلون) کا قریب اللفظ ترجمہ "کیا پس نہیں سمجھتے ہو؟" اور "پھر کیا تم نہیں سمجھتے بوجھتے ہو؟" سے کیا۔ بعض نے اُردو محاورے کے لیے فاء عاطفہ کو ترجمہ میں نظر انداز کر دیا ہے اور "نہیں" کو فعل کے بعد لاتے ہیں یعنی "کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟" ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے فعل تعقلون کے محذوف مفعول کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یعنی "کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہو؟" "تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو؟" (تاہم بہتر ہوتا اگر یہاں محذوف مفعول کے لیے لائے گئے کلمات "اتنا بھی" یا "اتنی بات بھی" "توسین" (....) میں لکھے جاتے جس سے معلوم ہو جاتا کہ یہ اضافہ محاورے کی خاطر کیا گیا ہے ـــــ بعض حضرات نے فعل لازم کی طرح ترجمہ کیا ہے یعنی: "تو کیا تمہیں عقل نہیں ہے یا تم کو عقل نہیں" (یعنی کیا تم عقل والے نہیں ہو؟) اور بعض نے "کیا تم عقل سے کام (ہی) نہیں لیتے ہو؟" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے جو فعل "عقل یعقل" کے ایک اچھے بامحاورہ ترجمہ "عقل سے کام لینا" پر مبنی ہے اور ساتھ محاورے کے لیے ہی توسین میں (ہی) کو لائے ہیں۔ مذکورہ بالا تراجم کے تقابلی مطالعہ سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ترجمہ میں اصل زبان کے الفاظ اور ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے درمیان توازن برقرار رکھنا کتنا مشکل کام ہے۔

© rasailojarai
© rasailojarai
© rasailojarai

۲:۲۹:۲ الإعــراب

زیرِ مطالعہ قطعہ کی تین آیات میں سے ہر ایک آیت ایک ایک لمبے جملے پر مشتمل ہے اور ہر ایک لمبا جملہ کئی چھوٹے اسمیہ اور فعلیہ جملوں سے مل کر بنا ہے اور چھوٹے جملوں کو باہم مربوط کرنے کے لیے واو المعیت، واو حالیہ، واو عاطفہ یا ہمزۂ استفہام سے کام لیا گیا ہے ہر ایک آیت کے الگ الگ اعراب کی تفصیل یوں ہے:

(ا) ولاتلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون.

[وَ] عاطفہ ہے جس کے ذریعے ماقبل والے جملے کو مابعد والے جملے سے ملا یا گیا ہے۔ [لَاتَلْبِسُوا] فعل نہی صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ نہی کی وجہ سے فعل مجزوم ہے۔ علامتِ جزم آخری "ن" کا گر جانا ہے (دراصل "تلبسون" تھا) اور اس میں ضمیر فاعلین "انتم" مستتر ہے [الحقَّ] مفعول بہ (لہذا) منصوب ہے۔ علامت نصب "ق" کی فتحہ (ـَ) ہے [بالباطل] جار (بِ) اور مجرور (الباطل) مل کر متعلق فعل (لاتلبسوا) ہے۔ یہاں باء (بِ) "کے معنی" کے ساتھ "بھی ہو سکتے ہیں اور "کی مدد سے" بھی۔ ("بِ" کے استعمالات استعاذہ کی بحث میں بیان ہوئے تھے)۔ [وتکتموا] میں "واو" کو عاطفہ سمجھیں تو "تکتموا" "لاتلبسوا" پر عطف ہو کر مجزوم ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس "وَ" کو واو المعیت قرار دیں۔ تو پھر یہ فعل ("تکتموا") منصوب سمجھا جا سکتا ہے (جیسے "لا تاکلِ السمكَ وَتشربَ اللبنَ" میں "تشرب" منصوب ہے یعنی مچھلی کھانے کے ساتھ دودھ پینا اکٹھا نہ کرو)۔ دونوں صورتوں (جزم یا نصب) میں علامتِ جزم یا علامتِ نصب (تکتمون کے) آخری نون کا گر جانا ہے۔ اس طرح واو المعیت کی صورت میں عبارت کا مطلب یہ ہو گا کہ یہ دو کام (لَبسٌ = خلط ملط کرنا اور کتمان چھپانا) جمع نہ کرو [الحقَّ] فعل "تکتموا" کا مفعول بہ (لہذا) منصوب ہے یہاں تک (ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق) ایک جملہ مکمل ہو جاتا ہے مگر اس کے بعد ایک چھوٹا سا جملہ حالیہ بھی اسی جملے کا آخری حصہ یا تتمہ بنتا ہے۔ یعنی اگلی [وَ] حالیہ ہے اور [اَنتم] ضمیر مرفوع منفصل مبتدا ہے اور [تعلمون] فعل مضارع مع ضمیر فاعلین "انتم" (مستتر) ہے اور یہ فعل فاعل مل کر ایک جملہ فعلیہ ہے جو "انتم" (مبتدا) کی خبر ہے اور یہ جملہ اسمیہ (انتم تعلمون) اپنے سے پہلی "وَ" (حالیہ) کے ساتھ مل کر ایک حالیہ جملہ ہے جو اپنے سے پہلے جملے کے ("ولا تلبسوا" اور "تکتموا") کی ضمیر فاعلین (انتم) کا حال ہے (یعنی جانتے بوجھتے ہوئے "لبس" اور "کتمان" کے مجرم مت بنو)۔ یہاں تک پہلی آیت مکمل ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

۲ واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وارکعوا مع الراکعین۔

[وَ] عاطفہ (یعنی جملے کا جملے پر عطف کرنے کے لیے) ہے [اقیموا] فعل امر حاضر مع ضمیر فاعلین "انتم" (مستتر) ہے۔ اور [الصلوٰۃ] مفعول بہ ہو کر منصوب ہے علامتِ نصب آخری "ۃ" کی فتحہ (ـَ) ہے۔ اور یہ (اقیموا الصلوٰۃ) فعل فاعل مفعول مل کر ایک جملہ انشائیہ ہے (فعل امر والا جملہ انشائیہ کہلاتا ہے کیونکہ اس میں "خبر" نہیں ہوتی)، اس کے بعد اگلی [وَ] بھی عاطفہ ہے اور [آتوا] فعل امر حاضر مع ضمیر فاعلین "انتم" (مستتر) ہے اور [الزکوٰۃ] مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے یہاں بھی علامتِ نصب "ۃ" کی فتحہ (ـَ) ہے اور یہ (آتوا الزکوٰۃ) بھی مثل سابق جملہ انشائیہ ہے۔ اگلی [وَ] پھر جملے کو جملے سے ملانے والی "عاطفہ" ہے۔ اور [ارکعوا] فعل امر حاضر مع ضمیر فاعلین (انتم) ہے [مَعَ] ظرف مکان ہے جو مبنی بر فتحہ ہوتا ہے (یعنی اس کے آخر پر ہمیشہ فتحہ (ـَ) رہتی ہے)۔ اور یہ آگے (تمام ظروف کی طرح) مضاف ہے [الراکعین] مضاف الیہ [illegible] نون سے پہلے والی یائے ماقبل مکسور (ـِی) ہے اور یہ (ارکعوا مع الراکعین) بھی ایک جملہ انشائیہ ہے اور یہ تین جملے "اقیموا الصلوٰۃ"، "آتوا الزکوٰۃ" اور "ارکعوا مع الراکعین" واو عاطفہ کے ذریعے باہم مل کر پوری آیت بنتی ہے۔

۳ أتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم وانتم تتلون الکتب۔

[أَ] ہمزۂ استفہام یہاں تعجب اور مذمت کا مفہوم رکھتا ہے۔ [تأمُرُون] فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین "انتم" (مستتر) ہے [النَّاسَ] فعل "تأمرون" کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے علامت نصب آخری "س" کی فتحہ (ـَ) ہے۔ [بالبِرّ] جارّ (بِ) اور مجرور (البِرِّ) مل کر متعلق فعل "تامرون" ہے اور یہ باء (بِ) اس فعل (امر یامر) کے دوسرے مفعول پر (جس بات کا حکم دیا جائے) بطور "صلہ" آتی ہے۔ ترکیب کے لحاظ سے یہاں تک (اتامرون الناس بالبر) ایک جملہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد [وَ] عاطفہ ہے جس کے ذریعے آگے آنے والا فعل "تنسون" سابقہ فعل "تأمرون" پر عطف ہے اور [تنسون] فعل مضارع معروف مع ضمیر فاعلین "انتم" ہے اور [انفسکم] مضاف (انفس) اور مضاف الیہ ضمیر مجرور (کم) مل کر فعل "تنسون" کا مفعول بہ ہے۔ اسی لیے "انفس" منصوب ہے علامت نصب آخری "س" کی فتحہ (ـَ) ہے اور لفظ "انفس" بوجہ اضافت خفیف (تنوین سے خالی) ہے۔ اس طرح "تنسون انفسکم" بھی ایک مکمل جملہ فعلیہ ہے جو واو عاطفہ کے ذریعے سابقہ جملے سے ملایا گیا ہے (یعنی تم "یہ کام" اور "یہ کام" کرتے ہو) اس کے بعد والی [وَ] حالیہ ہے جو مابعد والے جملے کو ماقبل جملے کی ضمیر فاعلین (انتم) کا حال

© rasailojaraid.c

بناتی ہے اور [انتم] ضمیر مرفوع منفصل یہاں مبتدأ ہے [تتلون] فعل مضارع معروف جمع حاضر مذکر ہے۔ [الکتابَ] فعل "تتلون" کا مفعول بہ (لہٰذا منصوب ہے۔ علامتِ نصب آخری "ب" کی فتحہ (ــَـ) ہے اور یہ جملہ فعلیہ (تتلون الکتاب) "انتم" (مبتدأ) کی خبر کا کام دے رہا ہے اور مبتدأ خبر (انتم تتلون الکتاب) جملہ اسمیہ بن کر فعل "تنسون" کی ضمیر فاعلین "انتم" کا حال ہے۔ اور یہ جملہ "حال" ہونے کی وجہ سے ایک طرح سے سابقہ دو جملوں (اتامرون .... انفسکم) کا ہی حصہ ہے کیونکہ حال اور ذوالحال ایک ہی عبارت شمار ہوتے ہیں۔

④ افلا تعقلون۔

اس میں [أ] استفہامیہ اور فاء [فَ] عاطفہ ہے اور [لا تَعقِلُونَ] فعل مضارع معروف منفی صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر فاعلین "انتم" مستتر ہے۔ ابھی بیان ہوا تھا [۲:۲۹:۱(۹) میں] کہ جب کسی عبارت میں حرفِ استفہام (أ یا ھَل) اور کوئی حرفِ عطف (وَ، فَ یا ثم) اکٹھے ہو جائیں تو عام قاعدہ تو یہ ہے حرفِ عطف پہلے اور حرفِ استفہام بعد میں آنا چاہیے تاہم یہ قاعدہ "ھَل" میں تو چلتا ہے جیسے "فَھَل" (پس کیا) میں حرفِ عطف + حرفِ استفہام ہے مگر دوسرے حرفِ استفہام (أ) کی صورت میں ایسا نہیں ہوتا یعنی "فَأ" استعمال نہیں ہوتا بلکہ "أفَ" (اور اسی طرح "أَثُمّ") استعمال کرتے ہیں یعنی ترتیب الٹ جاتی ہے۔

تاہم بعض نحوی ایسے موقع پر اس "فا (ف)" سے پہلے ایک محذوف فعل بلکہ جملہ فعلیہ کو اس کا معطوف علیہ مانتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ عبارت کو نحوی اعتبار سے زیادہ قابلِ فہم بنانے کے لیے ایسا کرتے ہیں یعنی وہ اصل عبارت کو یوں (مقدر) سمجھتے ہیں "أ (تفعلون ھذا) فلا تعقلون" (کیا تم ایسا کرتے ہو پس سمجھتے نہیں) اور یہی وجہ ہے کہ بعض مترجمین نے ترجمہ میں حرفِ عطف (فا) کو نظر انداز کر دیا ہے اس آخری جملے (افلا تعقلون) کے مختلف تراجم ابھی اوپر "اللغۃ" والے حصے [۲:۲۹:۱(۹)] کے آخر پر بیان ہو چکے ہیں۔

۲:۲۹:۳ الرسم

زیرِ مطالعہ قطعہ آیات میں بھی بیشتر کلمات کا رسم عثمانی اور رسم املائی ایک جیسا ہے۔ البتہ پانچ کلمات کے رسم قرآنی پر ذرا تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں سے بعض کا رسم قرآنی رسم املائی سے مختلف ہے۔ اور بعض کا رسم عثمانی (قرآنی) بھی مختلف فیہ ہے۔ یہ کلمات ہیں: "الباطل، الصلاۃ، الزکاۃ، الراکعین اور الکتاب" (یہاں ہم نے ان سب کو عام رسم املائی کے مطابق ہی لکھا ہے تاکہ فرق واضح ہو سکے)، تفصیل یوں ہے۔

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

① "الباطل": یہ لفظ (بصورت معرفہ یا نکرہ) قرآن کریم میں ۲۵ کے قریب مقامات پر آیا ہے۔ علمائے رسم میں سے ابوداؤد سلیمان بن نجاح (المتوفی ۴۹۶ھ) کی طرف منسوب قول کے مطابق (جو مورد الظمآن وغیرہ کتب رسم میں منقول ہوتے ہیں[1]) تمام مقامات پر یہ لفظ بحذف الالف (بعد الباء) لکھا جانا چاہیے یعنی بصورتِ "بطل" یا "البطل"۔ مگر ابوداؤد کے استاد ابوعمرو عثمان سعید الدانی (المتوفی ۴۴۴ھ) نے صرف دو مقامات (الاعراف: ۱۳۸ اور ہود: ۱۶) پر اس کو بحذف لکھنے کی تصریح کی ہے جو اس بات کو مستلزم ہے کہ باقی جگہوں پر یہ باثبات الالف (بعد الباء) ہی لکھا جائے گا۔ بلکہ الدانی نے بعض دوسرے اوزان کے ساتھ "فاعِلٌ" کو بھی ان اوزان میں شمار کیا ہے جن کے وزن پر آنے والے الفاظ مصاحف میں باثباتِ الالف لکھے جاتے ہیں[2]۔ ماسوائے ان مقامات کے جن کے استثناء کی تصریح کر دی جائے (جیسے اس لفظ کے بارے میں دو مقامات کی تصریح اُوپر مذکور ہوئی ہے)

لفظ "باطل" کے رسم کے بارے میں اس اختلاف کی بنا پر بیشتر افریقی اور عرب ممالک کے مصاحف میں اسے بحذفِ الف یعنی بصورت "بالبطل" لکھا جاتا ہے۔ لیبیا کے مصاحف میں بصورت اختلاف الدانی و ابوداؤد پر ترجیح دینے کے اصول پر اسے باثباتِ الف "بالباطل" لکھا جاتا ہے۔ برصغیر اور تمام مشرقی ایشیائی ممالک میں بھی اسے باثبات الالف (بالباطل) ہی لکھا جاتا ہے (صرف تجویدی قرآن مطبوعہ پاکستان میں مصری مصاحف کی تقلید میں اسے بحذفِ الف (بالبطل) لکھا گیا ہے) صاحبِ نثر المرجان نے بھی اس کے بارے میں "اثبات الالف بعد الباء علی الاکثر" لکھ کر ساتھ اس پر الدانی، الشاطبی اور السیوطی کے دلائل کا ذکر کیا ہے[3]۔

② "الصلوة اور الزکوة" بالاتفاق ان آٹھ کلمات میں سے ہیں (باقی چھ "الحیوة، الغدوة، کمشکوة، النجوة، منوة اور الربو" ہیں) جو قرآنِ کریم میں "و" کے ساتھ لکھے جاتے ہیں یعنی ان میں الف بصورت "و" لکھا جاتا ہے (پڑھا اسے الف ہی جاتا ہے جو بذریعہ ضبط ظاہر کیا جاتا ہے)۔ البتہ کسی ضمیر کی طرف مضاف ہوں تو "و" کی بجائے "ا" سے ہی لکھے جاتے ہیں مثلاً "صلاتی ، صلاتھم" وغیرہ ہیں (بلکہ ان میں سے بھی بعض مقامات پر "و" ہی لکھی جاتی ہے[4])۔ عام عربی

---

[1] ابوداؤد کی اصل کتاب "التنزیل فی ہجاء المصاحف" ابھی تک کہیں طبع نہیں ہوئی۔

[2] تفصیل کے لیے دیکھئے لطائف البیان (زیتحار) ج ۱ ص ۴۲۔ سمیر الطالبین (للضباع) ص ۳۹، ۴۰۔ تلخیص الفوائد (العقیلہ) ص ۲۶ اور المقنع (للدانی) ص ۱۱۔

[3] نثر المرجان (للارکاتی) ج ۱ ص ۱۳۷۔

[4] تفصیل کے لیے دیکھئے المقنع ص ۵۴۔ نیز [۲ : ۲ : ۳ (۱)] میں بھی اس پر بات ہو چکی ہے۔

© rasailojaraid
© rasailojaraid

املاء میں ان کو "الصلاۃ اور الزکاۃ" لکھا جاتا ہے تاہم عام املاء میں بھی عموماً ان کے قرآنی املاء (الصلوۃ اور الزکوۃ) کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیونکہ تلاوت کی وجہ سے لوگ اس سے مانوس ہیں۔

(۳) "الراکعین" رسم معتاد (عام عربی املاء) میں تو اسی طرح لکھا جاتا ہے مگر رسم عثمانی کے مطابق یہ لفظ بالاتفاق بحذف الالف (بعد الراء) لکھا جاتا ہے یعنی بصورت "الرکعین" پھر اس محذوف الف کو پڑھنے کے لیے بذریعہ ضبط ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ بصورت جمع مذکر سالم قرآن کریم میں تین جگہ وارد ہوا ہے۔ اور ہر جگہ "ر" کے بعد والے الف کے بغیر ہی لکھا جاتا ہے۔ البتہ بصورت مفرد منصوب یعنی "راکِعًا" ایک جگہ (ص: ۲۴) آیا ہے اور وہاں یہ باثبات الالف ہی لکھا جاتا ہے (راکعًا)۔ اور یہ بھی رسم عثمانی کا متفقہ طریقہ ہے۔ البتہ بصورت جمع "الرکعین" کو "ر" کے بعد الف سے لکھنا رسم عثمانی کی خلاف ورزی ہے جس کا رواج ترکی اور ایران میں زیادہ ہو گیا ہے۔

(۴) "الکتاب" کا عام عربی املاء اسی طرح باثباتِ الالف ہے تاہم قرآنِ کریم میں ہر جگہ (معرفہ ہو یا نکرہ اور مفرد ہو یا مرکب) حذف الالف (بعد التاء) کے ساتھ یعنی "الکتب" یا "کتب" لکھا جاتا ہے (اور یہ لفظ قرآنِ کریم میں ۲۵۰ سے زیادہ جگہ آیا ہے۔ البتہ صرف چار مخصوص مقامات پر یہ باثبات الالف بصورت "کتاب" لکھا جاتا ہے ان کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔ نیز دیکھئے البقرہ ۲: [۲:۱:۳ (۱)] میں۔

۲:۲۹:۴ الضبط

زیرِ مطالعہ آیات کے کلمات کے یکساں یا مختلف ضبط کو درج ذیل نمونوں سے سمجھا جا سکتا ہے اس میں خصوصاً قابل توجہ "الصلوۃ اور الزکوۃ" کے ضبط کا اختلاف ہے۔ برصغیر، ترکی اور ایران میں آخری "و" کو ہر طرح کی علامتِ ضبط سے خالی رکھا جاتا ہے اور صرف "ل" یا "ک" پر علامتِ اشباع (کھڑی زبر ـٰ) ڈالی جاتی ہے اور علامتِ ضبط سے خالی حرف (جیسے یہاں "و" ہے) کو نہیں پڑھا جاتا مگر افریقی اور عرب ملکوں کے مصاحف میں "ل" اور "ک" پر فتحہ (ـَ) ڈالی جاتی ہے پھر "و" پر ایک چھوٹا سا الف (کھڑی زبر ـٰ کی طرح) لکھا جاتا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ یہاں "و" کو الف پڑھنا ہے۔ وہ لوگ یا تو اپنی عربی دانی کی بنا پر یہاں "و" کے تعلیل صرفی کے لحاظ سے "الف" میں بدل جانے کے اصول کو سمجھتے ہوتے — یا پھر بچپن ہی سے اس طرزِ ضبط سے واقف ہونے کی بنا پر — ٹھیک پڑھ لیتے ہوں گے۔ مگر مشرقی ممالک کا کوئی بھی قاری "ل" یا "ک" کی فتحہ (ـَ) اور پھر آگے "و" پر علامتِ اشباع (کھڑی زبر ـٰ) دیکھ کر اسے "صلاۃ" اور "زکاۃ" پڑھنے کی بجائے

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

ضرور "صلٰوۃ" کو "صلوات" اور "زکٰوۃ" کو "زکوات" ہی پڑھ جائے گا۔ جن لوگوں کو حج اور عمرہ کے موقع پر جبراً سعودی مصاحف سے ہی تلاوت کرنی پڑتی ہے وہ ضبط کے اس فرق کو ذہن میں رکھیں تو شاید (ان دو کلمات کی) صحیح قراءت کر سکیں گے ـــــ اختلافِ ضبط کے نمونے حسبِ ذیل ہیں

وَلَا، لَا / تَلْبِسُوا، تَلْبِسُوْا / الْحَقَّ، اَلْحَقَّ، اَلْحَقَّ / بِالْبَاطِلِ،
بِالْبَاطِلِ، بِالْبَاطِلِ، بِالْبٰطِلِ / وَتَكْتُمُوا، تَكْتُمُوْا / الحق (مثل
سابق) / وَاَنْتُمْ، اَنْتُمْ، ءَاَنْتُمْ / تَعْلَمُوْنَ، تَعْلَمُونَ، تَعْلَمُوْنَ /
وَاَقِيْمُوا، اَقِيْمُوا، اَقِيْمُوا / الصَّلٰوةَ، اَلصَّلٰوةَ، اَلصَّلٰوةَ / وَاٰتُوا،
اٰتُوا، ءَاتُوا / الزَّكٰوةَ، اَلزَّكٰوةَ، اَلزَّكٰوةَ / وَارْكَعُوْا، اَرْكَعُوْا،
اَرْكَعُوْا / مَعَ الرّٰكِعِيْنَ، اَلرّٰكِعِيْنَ، الرّٰكِعِيْنَ / اَتَاْمُرُوْنَ،
اَتَاْمُرُوْنَ، ءَاَتَاْمُرُوْنَ / النَّاسَ، اَلنَّاسَ، اَلنَّاسَ / بِالْبِرِّ، بِالْبِرِّ،
بِالْبِرِّ / وَتَنْسَوْنَ، تَنْسَوْنَ، تَنْسَوْنَ / اَنْفُسَكُمْ، اَنْفُسَكُمْ، ءَاَنْفُسَكُمْ /
وَاَنْتُمْ، اَنْتُمْ، ءَاَنْتُمْ / تَتْلُوْنَ، تَتْلُوْنَ، تَتْلُوْنَ / الْكِتٰبَ،
اَلْكِتٰبَ، اَلْكِتٰبَ / اَفَلَا، اَفَلَا، ءَاَفَلَا / تَعْقِلُوْنَ، تَعْقِلُوْنَ،
تَعْقِلُوْنَ۔

نوٹ: "تلبسوا، تکتموا، اقیموا اور اٰتوا" کو آگے ملانے کے لیے سب جگہ "و" کا ضبط یکساں ہے یعنی ـــ خالی از علامت۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com